© rasailojaraid.com

رشید احمد (جالندھری)

رسولِ کریم ﷺ کا اسوۂ حسنہ اور ہمارے موجودہ مسائل

حالیہ وقت میں ہماری اجتماعی زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا شعبہ ہو، جس میں انتشار، بدنظمی اور کرپشن کا عمل دخل نہ ہو۔ سوسائٹی کی ایک بڑی تعداد معاشی طور پر انتہائی تنگ دست ہے۔ چنانچہ ایک عام آدمی کے شب و روز اسی فکر میں گزر رہے ہیں کہ اس کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے خرچ کہاں سے آئے گا؟ اور اگر کوئی بیمار پڑ گیا تو اسے علاج معالجہ کی سہولت کیوں کر میسر آئے گی؟ اگر کسی سے قرض مل بھی گیا تو اس بات کی کیا ضمانت کہ صحیح دوا وقت پر مل سکے گی۔ غرضیکہ ہماری سوسائٹی کی ایک بڑی تعداد کے لیے زندگی بوجھ بن گئی ہے۔ جہاں تک کھاتے پیتے اور خوش حال گھرانوں کا تعلق ہے، انہیں یہ غم کھائے جا رہا ہے کہیں ان کا کوئی عزیز چوری، ڈکیتی یا فرقہ وارانہ فسادات کا شکار نہ ہو جائے اور جنہیں خدا نے فکر و نظر اور قومی درد سے نوازا ہے، ان کا کہنا ہے کہ ''بے دست و پا کو دیدۂ بینا نہ چاہیے۔'' قرآن مجید نے اس سنگین صورتِ حال کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: (آج) لوگوں کی اپنی کرتوتوں سے بر و بحر میں فساد کی آگ بھڑک اٹھی ہے۔ (الروم: ۴۱)

ذہنی کرب والم سے نجات پانے کے لیے زندگی کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لیتی ہے۔ بعض لوگ دنیا کے بڑے بڑے پیغمبروں، فلسفیوں اور عارفوں کی زندگیوں میں اپنی بے چینی کی دوا پاتے ہیں۔ بعض خوش بخت سکونِ قلب کی تلاش میں سماجی خدمت اور انسانیت کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں اور ادبی ذوق رکھنے والے اپنے حزن و یاس کو شعر و ادب میں انڈیل دیتے ہیں اور فصلِ گل کو بھی موت کا پیغام جانتے ہیں۔ فانی نے کہا تھا:

فصلِ گل آئی یا اجل آئی کیوں درِ زنداں کھلتا ہے؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اہلِ نظر کی ایک بڑی تعداد اخلاص سے یہ رائے رکھتی ہے کہ ہمیں مذہبی مظاہروں اور سیاسی تماشوں سے ہٹ کر سنجیدگی سے محسنِ انسانیت آنحضرت ﷺ کی سیرتِ طیبہ کا مطالعہ کرنا چاہیے، اس سے ہمیں اپنی انفرادی اصلاح کے ساتھ ساتھ اجتماعی مسائل کے حل کرنے میں بھی مدد ملے گی۔ 'دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمہی تو ہو'

آنحضرت ﷺ کی سیرتِ طیبہ پر لکھنے سے قبل نہایت ہی اختصار سے عرب سوسائٹی کی اجتماعی زندگی پر لکھنا بے جا نہ ہوگا۔ عرب سوسائٹی مجموعی طور پر ایک بت پرست سوسائٹی تھی، جس میں خدا پرستی اور توحید کا تصور یک قلم اجنبی تھا۔ وہ دوسری زندگی کی بھی قائل نہیں تھی۔ اسے اس بات پر تعجب تھا کہ آنحضرت ﷺ بار بار موت کے بعد دوسری زندگی کی خبر دیتے ہیں کہ وہاں ہر آدمی کو اپنے کیے کا حساب دینا ہوگا۔ عرب سوسائٹی صرف یہ جانتی تھی کہ قبر کے پرے کوئی زندگی نہیں۔ یہ صرف 'وقت' ہی ہے جو ہماری بربادی کا سبب ہے۔ (الجاثیہ: ۲۴) جب مر کر ہماری ہڈیاں تک بکھر جائیں گی، پھر وہ دوبارہ زندگی کا لباس کیوں کر پہنیں گی؟ (الاسراء: ۴۹) ایک معروف عرب شاعر امراؤ القیس کا کہنا ہے کہ کیا ہم ایک اندھی تقدیر کے غلام نہیں؟ ہم خود اپنے آپ کو فریب دیتے ہیں۔ یہ موت ہے جو میری جوانی اور زندگی کو مٹی میں بدل دیتی ہے۔ الغرض اہلِ مکہ کے پاس زندگی کا کوئی صحت مند اور روحانی مفہوم نہیں تھا۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ مکہ کی سوسائٹی میں چند لوگ یقیناً ایسے تھے، جو سچائی کی تلاش میں رہتے۔ وہ نہ تو بت پرستی کرتے اور نہ ہی فقر و غربت کے ڈر سے اولاد کو قتل کرتے۔ ان بے قرار روحوں میں ایک زید بن عمر تھے، جو کہتے: ''خدایا! اگر مجھے علم ہوتا کہ تیری پرستش کیسے کروں، جو تجھے پسند ہے، تو میں یقیناً ایسا ہی کرتا۔ لیکن (صد حیف!) میں یہ نہیں جانتا۔''[1] وہ اپنے آپ کو دینِ ابراہیمی کا پیرو گردانتے تھے۔ انہی حق پرستوں میں حضرت خدیجہؓ اور ان کے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل بھی تھے جو آسمانی نوشتوں کے نہ صرف ماہر بلکہ نصرانی بھی ہو گئے تھے۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ عرب سوسائٹی میں جہاں اخلاقی کمزوریاں اور گمراہیاں تھیں، وہاں ان میں بعض خاندانی اور روایتی خوبیاں بھی تھیں، مثلاً

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہادری، پاک دامنی، بلند نظری، مہمان نوازی، عزتِ نفس، شاعری اور اپنی زبان سے محبت۔ واقعہ یہ ہے کہ عرب سوسائٹی کی فطری صلاحیتیں اپنی راہ سے بھٹک گئی تھیں۔ رسول کریم ﷺ نے ان صلاحیتوں کے سامنے خدائی راہ کھول دی، تاکہ وہ زندگی میں ایک مثبت کردار ادا کر سکیں۔

مکہ کی تجارت پیشہ سوسائٹی کی قیادت مکہ کے معروف قبیلہ قریش کے پاس تھی، قریش کعبہ کے پاسبان تھے اور ان کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ کعبہ کی تولیت تھی۔ قریش مکہ اشرافیہ کلاس میں شمار ہوتے تھے۔ اس کے پاس کوئی اخلاقی ضابطہ نہیں تھا جو سوسائٹی میں عدل و انصاف کے قیام کا ضامن ہوتا اور مکہ میں بسنے والے تمام انسانوں کے وقار کا تحفظ کرتا۔ چنانچہ مکہ کی غریب آبادی کے لیے ایک باوقار زندگی بسر کرنا ناممکن تھا۔ روزمرہ کی زندگی کی بے سروسامانی میں اضافہ اس وجہ سے بھی ہوتا تھا کہ قبائلی جنگوں کا سلسلہ برابر جاری رہتا۔ جن کی وجہ سے ہر طرف بربادی کے سوا کچھ نظر نہ آتا۔ اس تلخ حقیقت سے اہلِ مکہ کے بعض اصحابِ درد آگاہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے مکہ کے ایک بااثر شہری عبداللہ بن جدعان کے گھر میں ایک اجتماع منعقد کیا۔ جس میں آنحضرت ﷺ بھی جب آپ کی عمر صرف بیس سال تھی، شریک ہوئے۔ اس اجتماع میں یہ طے پایا کہ ہم میں سے ہر آدمی مظلوم کی امداد کرے گا اور مکہ میں کسی ظالم کو رہنے نہیں دیا جائے گا۔ چونکہ یہ معاہدہ (حلف الفضول) ایک بلند مقصد کے لیے وجود میں آیا، اس لیے آنحضرت ﷺ عہدِ نبوت میں اس معاہدے کے بارے میں فرمایا کرتے: ''میں عبداللہ بن جدعان کے گھر میں ہونے والے معاہدہ میں موجود تھا۔ میں اس کے مقابلہ میں سرخ اونٹوں (عربوں کا سب سے قیمتی سرمایہ) کو بھی پسند نہیں کرتا۔ اگر (آج بھی خوں ریزی کو روکنے کے لیے) مجھے اس معاہدہ کے لیے بلایا جائے تو میں یقیناً اسے قبول کروں گا۔''(۲)

الغرض ساتویں صدی عیسوی میں مکی زندگی ایک نازک دور سے گزر رہی تھی۔ ایک طرف زمین و آسمان کے رشتے ٹوٹ چکے تھے، دوسری طرف سوسائٹی کی مغرور اشرافیہ کے ہاتھوں غریبوں اور غلاموں کی زندگی اپنی حرمت کھو بیٹھی تھی۔ ایسے نازک وقت میں تاریخ کے سٹیج پر آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی جلوہ افروز ہوئی۔ اس وقت کے عرب معاشرے کا ذکر کرتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوئے مرحوم پروفیسر آربری نے لکھا ہے: ''ہمیں اس بات سے بہ خوبی آگاہ رہنا چاہیے کہ قرآن ایسے وقت میں نازل ہوا، جب رومی اور یونانی تہذیبیں مکمل طور پر ختم ہو چکی تھیں۔ یہودیت اور نصرانیت شکست خوردہ مذاہب کی صورت اختیار کر گئے تھے۔ تعلیماتِ قرآن کا شکریہ! کہ ان کی بدولت تاریخ میں عرب پہلی قوم ہے جو تہذیبوں کی حیات و موت کے راز سے پوری طرح آگاہ ہوئی۔ نیا دین جو کسی معنی میں بھی نیا دین نہیں تھا، بلکہ اسی حقیقت کا نیا ظہور تھا جو ہمیشہ سے کائنات میں جلوہ گر رہی ہے اور جسے انسان نے اس لیے گم کر دیا تھا کہ وہ ماضی کی سنگین غلطیوں سے اجتناب کرنے میں ناکام رہا تھا اور اس نے خدائی مشیت کے خلاف بغاوت کی تھی۔''(۳)

آپ نے شروع میں تین سال تک نہایت ہی خاموشی سے اپنے ملنے والوں سے اپنی دعوت کا تذکرہ کیا۔ چنانچہ جن لوگوں نے آغاز میں اس دعوت کو قبول کیا، وہ تقریباً وہی لوگ تھے، جو سوسائٹی کی مروجہ روش سے خوش نہیں تھے اور حق کی تلاش میں تھے۔ مثلاً آپ کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہؓ، حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت علیؓ اور دوسرے معزز صحابۂ کرامؓ۔ لیکن ایک وقت کے بعد آپ کو حکم ہوا کہ وہ اپنی دعوت کا کھل کر پرچار کریں۔ (الحجر:۹۴) چنانچہ آپ نے مقامِ صفا پر اہلِ مکہ کو بلایا اور کہا: ''اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر تم پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہے، تو کیا تم میری بات مان لو گے؟'' ''ہاں!'' سب نے کہا، ''کیوں کہ ہم آپ کو ایک راست باز انسان کی حیثیت سے جانتے ہیں۔'' یہ سن کر آپ نے فرمایا، ''تو سنیئے! میں تمھیں ایک آنے والے سخت عذاب سے متنبہ کر رہا ہوں۔'' یہ کہنا تھا کہ قریش کے مغرور سردار ناراض ہو کر واپس چلے گئے۔ ابولہب بھڑک اُٹھا اور کہا، ''... کیا تم نے اسی لیے ہمیں یہاں بلایا تھا؟''(۴)

آپ نے اپنی دعوت کو جاری رکھا اور بار بار اہلِ مکہ کو یاد دلایا کہ اس کائنات کا خالق خدا ہے، جو سب سے بے نیاز ہے۔ اس تخلیق میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس لیے صرف وہی ذات پرستش کی مستحق ہے۔ لیکن اہلِ مکہ اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ اپنی بت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پرستی کو خدائی قرب کا ذریعہ قرار دیتے تھے۔ (الزمر: ۳)

آپ نے مزید فرمایا کہ یہ زندگی کھیل کود اور متاعِ غرور کے سوا کچھ اور نہیں۔ اس لیے انسان کو اپنی نفسانی خواہشوں کے فریب میں آنا نہیں چاہیے۔ آپ نے اپنی دعوت میں جہاں خدائے تعالیٰ کے قادرِ مطلق ہونے اور بتانِ وہم وگماں کے توڑنے پر زور دیا۔ وہاں آپ نے یہ بھی بتایا کہ انسان زمین پر خدا کا نائب ہے اور دوسری مخلوقات کے برعکس آزاد ارادے اور علم وعقل کی نعمت سے بھی نوازا گیا ہے۔ چنانچہ انسان کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنا ایک فضیلت اور نیکی ہے اور جو لوگ اپنے غریب بھائیوں کی فلاح کے لیے کام نہیں کرتے، وہ دراصل دین کا انکار کر رہے ہیں۔ قرآن مجید میں آیا ہے: ''بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جو 'دین' کو جھٹلاتا ہے: یہ وہی (بدبخت) ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور غریبوں کو کھانا کھلانے کے لیے (لوگوں کو) ترغیب نہیں دیتا۔'' (الماعون: ۱-۳)

آپ نے اپنی دعوت میں توحید کے بعد معاشرے میں سماجی انصاف کے قیام پر زور دیا۔ آپ نے اس بات کی بار بار تلقین فرمائی۔ اہلِ مکہ نے جب دیکھا کہ ان کی شدید مخالفت بے نتیجہ رہی تو انھوں نے آپ سے ملنے کی خواہش اس شرط پر کی کہ آپ اپنے غریب ساتھیوں کو اپنی صحبت سے دور رکھیں۔ لیکن آپ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ (الانعام: ۵۲، الکہف: ۲۸)[(۵)]

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اہلِ مکہ کی شدید مخاصمت کی وجہ یہ نہیں تھی کہ آپ نے اپنی دعوت میں ان کو یا ان کے بتوں کو برا بھلا کہا تھا۔ اس کے برعکس آپ نے نہایت ہی صبر وتحمل اور حکمت و دانش سے کام لیتے ہوئے ان تک اپنا پیغام پہنچایا کیوں کہ قرآن کا فرمان یہی ہے۔ ''(اے پیغمبر!) لوگوں کو حکمت اور حسنِ وعظ سے اپنے پروردگار کی راہ کی طرف بلائیے اور (اختلاف رکھنے والوں سے) حسن وخوبی سے بحث کیجیے اور بے شک تمہارا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹک گیا ہے۔'' (النحل: ۱۲۵)

اسی حسنِ بیان سے متعلق سورۃ عنکبوت میں کہا گیا ہے کہ ''اہلِ کتاب سے بحث ونزاع نہ کرو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن بہترین طریق سے۔'' (عنکبوت:۴۶)

چنانچہ پیغمبرؐ اسلام نے پیغمبرانہ وقار کے ساتھ اپنی دعوت کو جاری رکھا جو آہستہ آہستہ مکہ اور حجاز کی سنگلاخ سرزمین میں آگے بڑھتی رہی۔ جب حریفوں سے کوئی جواب بن نہ پڑتا تو وہ آپ کو 'ساحر' (جادوگر) کہتے۔ لیکن ان کے اس الزام میں بھی اس بات کا اعتراف تھا کہ پیغمبرؐ اسلام کا اندازِ بیان اس قدر مؤثر اور دل آویز ہے کہ سننے والے وجد میں آ جاتے ہیں۔ گویا ان پر جادو کر دیا گیا ہے۔

قرآن مجید نے وعظ و ارشاد میں جہاں حکمت و دانش اور حسن و خوبی کی راہ پر چلنے کی تلقین فرمائی، وہاں رسولِ کریمؐ نے اپنی دعوت میں آزادئ رائے کے اظہار کا بھی کھل کر ذکر فرمایا کہ دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں۔ ہر آدمی دین کے بارے میں مکمل طور پر آزاد ہے۔ قرآن مجید نے صاف طور پر اعلان فرمایا: لا اکراہ فی الدین۔ (البقرہ:۲۵۶) یہ آیت مدنی دور سے تعلق رکھتی ہے۔ جب مسلم جماعت کو اس شدید مخاصمت کا سامنا نہیں تھا۔ جس سے اسے مکی دور میں واسطہ پڑا تھا۔ لیکن مکی دور کے دورِ ابتلاء میں بھی رسولِ کریمؐ نے واضح طور پر اہلِ مکہ سے فرمایا: ''میرا دین میرے ساتھ ہے اور آپ کا دین آپ کے ساتھ۔'' (الکافرون:۶) لیکن اہلِ مکہ نے اپنی جارحانہ روش کو ترک نہ کیا۔ وہ رسولِ کریمؐ کے اس بنیادی حق کو نہیں مانتے تھے کہ آپ اپنی دعوت کا پرچار کریں۔ آپ نے انہیں یہ بھی فرما دیا تھا کہ ''میں تم پر کوئی داروغہ نہیں ہوں کہ تم سے اپنی دعوت جبراً منواؤں۔'' لست علیھم بمصیطر۔ (الغاشیہ:۲۲؛ الانعام:۱۰۷)

حالیہ وقت میں پاکستانی سوسائٹی کا ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مذہبی بحث و مذاکرہ میں تشدد اور انتہاپسندی کا عمل دخل بڑھ گیا ہے اور پرامن اختلافِ رائے کی راہ ترک کر دی گئی ہے۔ مثلاً پاکستان کی مسلم جماعت دو بڑے گروہوں پر مشتمل ہے۔ اہل السنۃ اور اہلِ التشیع۔ دونوں گروہ اسلام کی بنیادی تعلیمات —— توحید، رسالت اور معاذ (حیات بعد الممات) کو مانتے ہیں۔ ان کے اختلافات کی نوعیت سیاسی، کلامی اور فقہی ہے۔ چنانچہ ہر گروہ کو اخلاص سے مذہبی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تعلیمات کی تشریح وتعبیر کا حق حاصل ہے اور وہ خوش اسلوبی سے اپنے اختلافِ رائے کا اظہار بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن اختلاف کی جائز حدود سے تجاوز کر کے تشدد، قتال، نفرت اور انتہا پسندی کی راہ اختیار کرنا مذہب کی مقدس تعلیمات کے خلاف ہے، اور پوری سوسائٹی کے لیے انتہائی مہلک بھی۔ چنانچہ ہمارا دینی، سیاسی اور قومی فرض ہے کہ ہم رسولِ کریمؐ کی سیرت طیبہ کی روشنی میں اپنا محاسبہ کریں کہ ہم کہاں تک رسول کریمؐ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کر رہے ہیں؟ یہی طرزِ عمل ہمیں دوسرے مذاہب؛ نصرانیت، ہندوازم اور اپنے پڑوسیوں سے، خواہ ان کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو، اختیار کرنا چاہیے۔ یہ وقت، حکمت و دانش، اور آنحضرتؐ کی سیرتِ طیبہ کا تقاضہ ہے۔ اگر ہم اسے پورا کریں گے تو اس میں ہمارا ہی بھلا ہے۔ اگر نہیں کریں گے تو پھر رسوائی ہمارا مقدر ہے، جس سے ہم بچ نہیں سکتے۔ فطرت کسی کی خاطر اپنے قوانین نہیں بدلتی۔

رسولِ کریمؐ نے توحید کے بعد سماجی انصاف کو اپنی دعوت کا بنیادی رکن قرار دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ توحید کے نظریہ میں بنی نوع انسان کی وحدت بھی مضمر ہے، جس کا ذکر قرآن مجید اور آنحضرت ﷺ نے بار بار فرمایا ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے کہ جب آپ کی دعوت اہلِ مکہ کی سخت مخالفت کے باوجود آگے بڑھتی گئی تو اہلِ مکہ کی اشرافیہ نے آپ سے ملنے کی خواہش کی۔ لیکن اس شرط پر کہ اس ملاقات میں آپ کے تنگ دست اہلِ ایمان شامل نہ ہوں، لیکن آپ نے اس شرط کو مسترد کر دیا۔ ایک وقت کے بعد عمائدین مکہ پھر ''نیا جال'' لائے اور کہا کہ اگر آپ (ﷺ) اپنی دعوت سے دست بردار ہو جائیں تو آپ مکہ کونسل (انتظامیہ) کے ممبر یا صدر بن سکتے ہیں۔ اگر مال و دولت کی ضرورت ہے، تو وہ بھی ہم فراہم کر سکتے ہیں۔ اس پیشکش کے جواب میں آپؐ نے فرمایا: ''میں جس پیغام کو لے کر آیا ہوں، اس سے مقصد نہ تو تمہاری سیادت و قیادت ہے اور نہ ہی تمہاری دولت۔ چنانچہ میں نے تمہیں اپنے پروردگار کا پیغام سنا دیا ہے... خدا میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ کر دے گا۔''(۶)

اہلِ مکہ سماجی انصاف کی پیغمبرانہ دعوت کو اپنے سماجی مقام (Social Status) کے لیے خطرہ تصور کرتے تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں نماز کے ساتھ ساتھ زکاۃ کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حلم بھی بار بار آیا ہے۔ نماز جہاں انسان کو اس کی معنوی بیماریوں — نفرت، حسد، لالچ — سے نجات دلاتی ہے اور اس کی بے قرار روح کو قرار بخشتی ہے (الرعد: ۲۸)، وہاں زکاۃ سوسائٹی کے نادار طبقہ کے لیے ایک باوقار زندگی کی ضمانت دیتی ہے۔

آنحضرت ﷺ نے انسانی خدمت کی عظمت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: "پوری مخلوق خدائی کنبہ ہے اور جو اس کنبے کے ساتھ جس قدر بہتر حسنِ سلوک کرتا ہے، وہ اسی قدر خدا کی نگاہ میں عزیز تر ہے۔"(۷) ایسے ہی آپ نے بنی نوع انسان کی وحدت کے بارے میں فرمایا: "خدایا! گواہ رہنا، سب بندے بھائی بھائی ہیں۔"(۸) آنحضرت ﷺ نے صحیح مسلم کی ایک حدیثِ قدسی میں فرمایا کہ "خدا قیامت کے روز آدمی سے پوچھے گا کہ میں بیمار ہو گیا، تم نے میری بیمار پرسی نہیں کی۔ بندہ تعجب سے کہے گا، بھلا ایسے کیسے ہوسکتا ہے تو تو رب العالمین ہے؟ خدا فرمائے گا کہ کیا تجھے معلوم نہیں، میرا فلاں بندہ تیرے قریب بیمار ہو گیا تھا اور تم نے اس کی خبر نہیں لی تھی اگر تو اس کی بیمار پرسی کے لیے جاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ اسی طرح خدا فرمائے گا کہ اے ابنِ آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا، مگر تو نے نہیں کھلایا۔ بندہ عرض کرے گا کہ بھلا ایسے کیسے ہوسکتا ہے کہ تجھے کسی بات کی احتیاج ہو؟ خدا فرمائے گا کہ کیا تجھے یاد نہیں کہ میرے فلاں بھوکے بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا اور تو نے انکار کر دیا تھا، اگر تو اسے کھانا کھلاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا..." الغرض قرآن اور اسلامی روایات نے واضح طور پر کہا ہے کہ "جو خدا سے محبت کرنا چاہتا ہے، اسے چاہیے کہ اس کے بندوں سے محبت کرے۔"(۹)

چنانچہ مکہ کی زندگی میں خوش حال اہلِ ایمان انفرادی طور پر اپنے غریب بھائیوں کی برابر امداد کرتے تھے۔ لیکن مدنی دور میں جب ایک نئی اخلاقی سوسائٹی کو سیاسی طاقت بھی مل گئی، تو سرکاری سطح پر مستحق افراد کو مالی امداد دی جاتی تھی۔ آپ کی رحلت کے بعد جب حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں بعض مسلم قبائل نے زکاۃ دینے سے انکار کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے ان کے خلاف جنگ کی اور کہا جو آدمی نماز اور زکاۃ میں فرق کرے گا (یعنی نماز تو پڑھتا ہے لیکن زکاۃ دینے سے انکار کرتا ہے)، اس کے خلاف جنگ کی جائے گی۔ یہاں یہ بات بھی یاد رہے کہ زکاۃ جن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لوگوں میں تقسیم کی جاتی ہے، ان میں ایک گروہ الفقراء کا بھی ہے۔ الفقراء میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں۔ (۱۰)

آپؓ کے بعد جب حضرت عمرؓ آئے، تو انہوں نے انسانی فلاح و بہبود کے لیے نئے نئے تجربے کیے، جن سے مقصد عدل و انصاف کے اصولوں پر مبنی سماجی اداروں کا قیام تھا۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ عدل و انصاف کے ادارے ان کی تمناؤں کے مطابق ابھی تک وجود میں نہیں آئے تو انہوں نے فرمایا: ''آج مجھے جن باتوں کا پتہ چلا ہے، اگر ان کا علم پہلے ہو جاتا تو میں مال دار لوگوں کے زائد سرمایہ کو چھین لیتا اور غریبوں میں تقسیم کر دیتا۔'' (۱۱) دوسرے متعدد واقعات سے بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ معیارِ زندگی یا تمدن و کلچر کے ارتقا کو ایک خاص حد تک آگے جانے کے قائل تھے۔ لیکن اگر معیارِ زندگی کی بلندی میں عیش و عشرت اور تن آسانی داخل ہو جائے تو یہ زندگی ان کی نظر میں زندگی نہیں تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے ریاست میں بعض لوگوں کو دو منزلہ یا سہ منزلہ مکان بناتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے اسے ناپسند کیا۔ (۱۲) ایسے ہی انہوں نے ہفتے میں ایک یا دو دن گوشت کھانے پر بھی پابندی لگا دی تھی۔ جب انہوں نے مدائن (ایران) کی فتح کے بعد اس علاقے کی دولت اور مسلم فوجوں کے مسائل کو دیکھا تو کہا ''کاش! ایران اور ہمارے درمیان آگ کا سمندر حائل ہوتا۔''

ان تمام باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمرؓ اس سوچ و بچار میں رہتے کہ انسانی ارادے کے عزم و ولولہ اور سخت کوشی کی زندگی کو عیش و عشرت کے فطری نتائج یعنی زوال و انحطاط سے کیسے بچایا جائے؟ چنانچہ وہ معاشرے کے ہر فرد کی بنیادی معاشی ضروریات کو تو پورا کرنے کے لیے برابر قدم اُٹھاتے رہے، لیکن تن آسانی کے جلو میں آنے والے فتنوں سے بھی آگاہ کرتے رہے۔ ان کے معاشی اقدامات کو ایک مصری اہلِ قلم محمد حسین ھیکل اپنی کتاب ''الفاروق عمرؓ'' میں سوشلسٹ معیشت کا نام دیتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ موجودہ وقت میں جب ہماری بیمار معیشت نے نادار طبقہ کی زندگی کو شرمندگی میں بدل دیا ہے، ہم عملی طور پر سیرتِ نبویؐ سے استفادہ کیوں کر کریں؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ سوسائٹی کا متمول طبقہ ایک مربوط پروگرام کے تحت سماجی خدمت کے لیے ہسپتال اور تعلیمی ادارے کھولے، جیسا کہ بعض حضرات نے کھول بھی رکھے ہیں۔ لیکن ان مسائل سے مؤثر طور پر عہدہ برآ ہونے کے لیے حکومت ہی ایک ٹھوس منصوبہ بندی کرسکتی ہے اور اس سلسلے میں نہ صرف زمیندارہ سسٹم کو ختم کرے، جس کی برطانوی راج نے سرپرستی کی اور لاکھوں کاشت کاروں کو غلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا(۱۳) بلکہ بعض ترقی یافتہ فلاحی معاشروں — برطانیہ، سویڈن، ناروے — کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ لیکن یہ کام وہی حکومت یا سیاسی جماعت کرسکتی ہے جو زندگی کے بلند نصب العین سے سرشار ہو اور بندۂ مزدور کے تلخ اوقات سے آگاہ۔ افسوس! اس نصف صدی میں ہم نے جاگیردارانہ سیاست کو ختم کرنے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ البتہ ۱۹۷۷ء کی فوجی حکومت نے نظامِ زکاۃ کا تعارف کرایا۔ لیکن وہ ایک مؤثر ادارے کی شکل اختیار نہ کرسکا۔ اگر اس کی انتظامیہ مخلص، اہل اور محنتی افراد پر مشتمل ہوتی اور سیاست اس پر شب خون نہ مارتی تو یہ ادارہ غریب طبقہ کی بہتر خدمت کرسکتا تھا۔ آج ہماری سوسائٹی کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ نادار طبقے کو باوقار طور پر زندہ رہنے کا حق کیوں کر دیا جائے؟ پیشہ ور اشرافیہ یا مافیہ کی حرص و آز پر قابو کیوں کر پایا جائے؟ یہ کام جاگیردارانہ معیشت اور سرمایہ دارانہ سیاست کو دفن کیے بغیر نہیں ہوسکتا۔

قریشِ مکہ نے اپنے سماجی مقام کے تحفظ کے لیے رسولِ کریم ﷺ کی دعوت کو ہر طریق سے ناکام کرنے کی کوشش کی۔ وہ رسول کریم ﷺ کے سرپرست چچا ابوطالب کے پاس پہنچے اور کہا کہ آپ اپنے بھتیجے کو اپنی دعوت سے روکیے بلکہ آپ ان کو ہمارے حوالے کردیں۔ حضرت ابوطالب نے قریشِ مکہ کے بدلے ہوئے تیور کو دیکھ کر آنحضرتؐ سے کہا: میرے عزیز بھتیجے! مجھ پر اتنا ہی بوجھ ڈالیے جتنا میں برداشت کرسکوں۔ رسولِ کریم ﷺ نے یہ خیال کیا کہ شاید ان کا شفیق چچا ان کی حمایت سے دست بردار ہونا چاہتا ہے۔ یہ سن کر آپ کی آواز بھر آئی اور فرمایا: خدا کی قسم! اگر یہ لوگ (قریشِ مکہ) میرے داہنے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیں تو بھی میں اپنی دعوت سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں، خواہ مجھے اپنی جان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہی سے ہاتھ دھونا پڑے۔ حضرت ابوطالب نے سید البشر کے ان تاریخی الفاظ کو سن کر فرمایا کہ جاؤ، کوئی آپ کے خلاف کچھ نہ کر سکے گا۔ تاریخ نے ہمیں بتایا ہے کہ حق کی آواز دنیا میں ایک ہی انداز سے بلند ہوتی رہی ہے۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتویں صدی عیسوی میں منکرین حق کے سامنے جو آواز بلند کی تھی وہی آواز صدیوں پہلے سقراط نے یونان کی عدالت میں بلند کی تھی۔

سقراط نے ایتھنز کی عدالت کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: ''تمہیں علم ہونا چاہیے کہ (حکمت اور سچائی کی تبلیغ) خدائی امر ہے۔ اور میرا اعتقاد ہے کہ خدا کے لیے میری بندگی سے بڑھ کر اہلِ ایتھنز کے لیے شاید ہی کوئی بڑی اچھائی ہوگی... میں اس کے سوا کچھ نہیں کہتا کہ میں تمہیں — جوان ہوں یا بوڑھے — یہ سمجھانے کی سعی کرتا ہوں کہ تمہاری پہلی اور بنیادی کوشش اپنے روحانی کمال کو حاصل کرنا ہے۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ نیکی کو دولت سے خریدا نہیں جاتا۔ اگر یہ نظریہ نوجوانو کو خراب (Corrupt) کر رہا ہے تو پھر میں واقعی ایک 'برا آدمی' ہوں۔ اے اہلِ ایتھنز! میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ تم مجھے بری کرو یا نہ کرو، میں ہرگز اپنی راہوں کو بدلنے والا نہیں ہوں۔ خواہ مجھے ایک بار نہیں (سو بار) بھی مرنا پڑے، میں نے اپنی اس دعوت سے کوئی مالی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کی سچائی پر سب سے بڑی دلیل میری غربت ہے... (دوستو! ایک دوسرے سے) جدا ہونے کی گھڑی آ پہنچی۔ ہمیں اپنی اپنی راہ پر چلنا ہوگا۔ مجھے موت کی راہ پر اور تمہیں زندگی کی راہ پر۔ کونسی راہ بہتر ہے؟ اسے صرف خدا ہی جانتا ہے۔''

تاریخ نے صدیوں بعد حق و باطل کی اسی کشمکش کو مکہ میں پھر دیکھا، جب پیغمبر اسلام نے پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ اعلان کیا: ''میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند بھی رکھ دو تب بھی میں اپنی راہوں کو بدلنے والا نہیں۔''

مکہ میں دعوت کا یہ سلسلہ تیرہ برس جاری رہا۔ پھر ایک وقت آیا کہ جب مکہ میں آپ کا غم خوار اور شفیق چچا ابو طالب اور آپ کی زوجہ محترمہ، جنہوں نے ہر مشکل وقت میں آپ کا ساتھ دیا تھا، دونوں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ آنحضرتؐ نے اس سال کو 'عام الحزن' قرار دیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طائف کا سفر:

ان دو عظیم شخصیتوں کی رحلت کے بعد رسولِ کریم ﷺ کے خلاف اہلِ مکہ کی جارحانہ روش کو روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ اب آپ مکہ کے جنوب مشرق میں طائف نامی شہر میں تشریف لے گئے۔ افسوس! طائف کے سرداروں نے آپ کی دعوت کو نہ صرف سننا گوارا نہیں کیا، بلکہ اپنے نوکروں اور اوباشوں کو بھی آپ کے خلاف اکسایا جو آپ پر پتھر پھینکتے اور آوازے کستے رہے۔ آپ کے پاؤں زخمی ہو گئے، خون بہنے لگا۔ وہ آپ کو جس حد تک ستا سکتے تھے، ستایا۔ آپ کے ساتھی حضرت زید بن حارثہؓ نے ہر ممکن طریق سے آپ کا دفاع کیا۔ دونوں نے انگور کے درخت کے نیچے پناہ لی جو عتبہ اور شیبہ کے باغ سے ملحق تھا، دونوں آپ کے دشمن تھے، اس لیے آپ نے ان کے باغ میں جانا پسند نہیں فرمایا۔ آپ نے خدا سے دُعا مانگتے ہوئے کہا: ''خدایا! میں اپنی کمزوری، بے سروسامانی اور لوگوں میں اپنی بے توقیری کا شکوہ تجھی سے کرتا ہوں، اے ارحم الراحمین! تو مظلوموں کا پروردگار ہے، تو میرا پروردگار ہے، تو میری تقدیر کس اجنبی کے حوالے کر رہا ہے جو میری عزت نہیں کرتا یا کس دشمن کو میرے امور کا مالک بنا رہا ہے؟ اگر آپ مجھ سے ناراض نہیں ہیں تو پھر میں کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔''(۱۴)

جب عتبہ اور شیبہ نے آپ کو دیکھا تو ان کا دل بھر آیا اور اپنے نصرانی نوکر عداس کے ہاتھوں آپ کی خدمت میں انگوروں کا ایک خوشہ نذر کیا۔ جب آپ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر انگوروں کو تناول فرمایا تو نوکر نے کہا کہ یہاں کے لوگ تو 'بسم اللہ' نہیں پڑھتے۔ آپ نے فرمایا، کس شہر سے اور کس دین سے تعلق ہے؟ ''میں نینوی کا نصرانی ہوں''، عداس نے کہا۔ ''اچھا تو آپ یونس بن متی کی بستی سے ہیں؟ جو پرہیز گار آدمی (رجل صالح) تھے۔'' آپ نے فرمایا۔ ''آپ یونس سے کیسے واقف ہیں'' تو آپ نے جواب میں قرآن مجید کی آیات کریمہ سنائیں۔ عداس یہ سن کر آپ کے ہاتھ پاؤں چومنے لگے اور مسلمان ہو گئے!! آبِ حیات کے کنارے پر بیٹھنے والے عتبہ اور شیبہ محروم! اور نینوی کا ایک بے نوا اجنبی سیراب۔ اقبال نے سچ کہا ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تو جو چاہے تو اٹھے سینۂ صحرا سے حباب
راہ رو دشت ہو سیلی زدۂ موجِ سراب

مکہ اور طائف کی معاندانہ سرگرمیوں سے پتہ چل گیا کہ اب منکرینِ حق ہر قیمت پر اسلام کی دعوت کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اسی اثنا میں مدینہ کے بعض لوگوں نے اسلام کو قبول کرلیا تھا اور مکہ کے بعض مسلمان وہاں پہنچ بھی گئے تھے۔ یہاں مکہ میں منکرینِ حق آپ کو شہید کرنے کی سازشوں میں مصروف تھے۔ لیکن آنحضرت ﷺ خاموشی سے اپنے جاں نثار ساتھی حضرت ابوبکر کی معیت میں مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچ گئے۔ جہاں پر انصارِ مدینہ آپ کی راہ تک رہے تھے۔ وہاں پہنچ کر مکی مسلمانوں کے اخلاقی جوہر کھلے۔ جب اجتماعی نظم ونسق مسلمانوں کے ہاتھ آیا، اور انہوں نے رسول اللہ کی رہنمائی میں بڑی کامیابی سے چلایا۔ ہم یہاں مدنی دور کے صرف دو واقعات کا ذکر کریں گے۔

ا۔ صلح حدیبیہ:

سنہ ۶ ہجری میں رسول کریم ﷺ صحابۂ کرام کی ایک جماعت کے ساتھ عمرہ ادا کرنے کے لیے مدینہ سے مکہ روانہ ہوئے، ابھی آپ مکہ سے چند میل کے فاصلہ پر حدیبیہ نامی ایک مقام پر پہنچے تھے کہ اہلِ مکہ نے فیصلہ کیا کہ وہ آنحضرت ﷺ اور ان کے ساتھیوں کو مکہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیں گے۔ خواہ اس کے لیے میدانِ کارزار ہی کیوں نہ گرم کرنا پڑے۔ آنحضرت ﷺ نے اس جنگ کو روکنے کے لیے مذاکرات کیے۔ چنانچہ جب مذاکرات کے بعد معاہدہ لکھنے کا وقت آیا تو آپ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ لکھئے: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اہلِ مکہ کے نمائندے سہیل نے اعتراض کیا کہ عربوں کے رواج کے مطابق ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کی بجائے ''باسمك اللھم'' لکھیے۔ آپ نے اس سے اتفاق کیا۔ (۲) آپ نے فرمایا کہ یہ معاہدہ اللہ کے رسول محمدؐ اور اہلِ مکہ کے درمیان ہے۔ اس پر بھی مکی نمائندہ سہیل نے اعتراض کیا کہ اگر ہم آپ کو پیغمبر مان لیتے ہیں تو پھر جھگڑا کس بات کا ہے! چنانچہ طے ہوا کہ لفظ رسولِ خدا کی بجائے آپ کے اسمِ گرامی کے ساتھ آپ کے مرحوم والد کا نام لکھا جائے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس معاہدے کی ایک دفعہ یہ تھی کہ اگر مکہ کا کوئی آدمی (مسلمان) مدینہ آ جائے تو اسے واپس مکہ بھیج دیا جائے۔ لیکن اگر مدینہ سے کوئی آدمی مکہ آ جائے تو اسے واپس نہیں کیا جائے گا۔ اس معاہدہ میں یہ بات بھی مان لی گئی کہ مسلمان اس سال نہیں بلکہ آئندہ سال تین دن کے لیے مکہ میں آ سکتے ہیں۔ اس معاہدے سے بعض مسلمان آزردہ تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس معاہدہ سے مسلمانوں کی سبکی ہوئی ہے۔ لیکن قرآن مجید نے اس معاہدے کو فتح قرار دیا۔ (سورۃ الفتح) کیونکہ امن نے جنگ پر فتح پائی تھی۔ نیز اہلِ مکہ جو آج تک آنحضرت ﷺ کی شخصیت کو نہیں مانتے تھے۔ اس معاہدہ میں انہیں ایک پارٹی کی حیثیت سے تسلیم کرلیا گیا۔

اس معاہدہ کو طے کرتے وقت آنحضرت ﷺ نے اہلِ مکہ کے اشتعال انگیز موقف کے مقابلہ میں جس صبر وتحمل کا مظاہرہ کیا، اس نے بتا دیا کہ آج مذاکرات کو کامیاب بنانے کے لیے پیغمبرانہ راہ پر چلنا کس قدر ضروری ہے۔ اس معاہدے پر تبصرہ کرتے ہوئے اپسلا یونیورسٹی کے پروفیسر توراندرے (Tor Andrae) نے لکھا: ’’ضبطِ نفس جس کا مظاہرہ محمد (ﷺ) نے حدیبیہ میں فرمایا اور ایک بلند مقصد کے حصول کے لیے معمولی باتوں پر توہین کو برداشت کرنے کی اہلیت، ان دونوں باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی شخصیت ایک منفرد اہلیت کی مالک تھی۔ آپ کی سی فکری برتری رکھنے والا انسان ہمیشہ اپنی باگوں کو اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے، حتیٰ کہ ایسے وقت میں بھی جب اسے ایک لمحہ کے لیے جھکنے پر مجبور کر دیا جائے۔ آخر وہ وقت جلد ہی آ گیا جب انہوں نے اپنی حکمت و دانش کا پھل جس کا مظاہرہ انہوں نے حدیبیہ میں کیا تھا، حاصل کرلیا۔‘‘(۱۵)

ہمیں انتہائی دکھ سے لکھنا پڑتا ہے کہ برصغیر اور جنوبی ایشیاء کے دو بڑے ملک (بھارت اور پاکستان) اپنے سیاسی اختلافات کو ابھی تک پرامن مذاکرات کے ذریعہ حل نہیں کر پائے جس سے دونوں ملکوں کے کروڑوں غریب عوام متاثر ہو رہے ہیں۔ دونوں ملک بنیادی طور پر امن اور شانتی کو ایک بلند قدر مانتے ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ اپنے اختلافات کا کوئی حل تلاش کرنے میں ناکام رہے۔ ہماری روحانی قدروں اور حکمت و دانش کا تقاضہ ہے کہ یہ مذاکرات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

برابر جاری رہنے چاہئیں اور باہمی تلخیوں، نفرتوں اور ایک دوسرے کے خلاف پروپیگنڈے کی مہم کو ختم کرنا ہوگا۔ یہ تین دھارے کا انوکھا خنجر لوہے کی دو دھاری تلوار سے زیادہ خطرناک ہے۔ ہمارے پیغمبر اعظم (ﷺ) نے ہمیں یہی درس دیا ہے کہ بلند مقاصد کے حصول کے لیے وسائل بھی بلند ہونے چاہئیں۔ اسی طرح مہاتما بدھ، اشوک، معین الدین چشتی اور گاندھی جی نے بھی اہلِ ہند کے لیے یہی روایات چھوڑی ہیں۔

۲۔ فتح مکہ:

حدیبیہ معاہدہ دس سال کے لیے تھا۔ اس معاہدے میں عربوں کے دو قبیلے: خزاعہ مسلمانوں کے حلیف تھے اور بنوبکر قریش کے۔ ان دونوں (بنوخزاعہ اور بنوبکر) قبیلوں میں باہمی عداوت تھی۔ چنانچہ بنوبکر نے موقعہ پاتے ہی بنوخزاعہ کے آدمیوں کو حرم کی حدود میں قتل کر دیا۔ خزاعہ کے خلاف بنوبکر کی جارحانہ کارروائیوں میں قریش نے بنوبکر کا ساتھ دیا۔ ان کا یہ قدم معاہدۂ حدیبیہ کے خلاف تھا۔ چنانچہ خزاعہ کے آدمی مدینہ میں آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے خلاف قریش اور بنوبکر کے خونی واقعات کو آنحضرت ﷺ کے علم میں لائے۔ جس سے آپ کو دکھ ہوا۔ آنحضرتؐ نے قریش کو پیغام بھیجا کہ وہ مندرجہ ذیل تینوں میں سے کسی ایک بات کو مان لیں:

(۱) خزاعہ کے مقتول آدمیوں کا خون بہا دیا جائے۔

(۲) قریش بنوبکر کی امداد بند کر دیں۔

(۳) حدیبیہ معاہدے کو توڑنے کا اعلان کر دیا جائے۔

چنانچہ قریش کے نمائندے نے تیسری شرط کو منظور کر لیا یعنی معاہدۂ حدیبیہ کو توڑنے کا اعلان کر دیا۔ ہر چند بعد میں قریش اپنے کیے پر نادم تھے، لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ ابوسفیان قریش کی طرف سے مکہ سے مدینہ پہنچا تا کہ معاہدۂ حدیبیہ کی تجدید ہو سکے، لیکن بات نہ بنی۔

آنحضرت ﷺ نے فتح مکہ [illegible] لیں اور رمضان سنہ ۸ھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں دس ہزار فوج کے ساتھ مکہ روانہ ہوئے اور مکہ کے قریب مرّالظہران نامی مقام پر پہنچ کر اعلان کر دیا کہ جو آدمی ہتھیار ڈال دے گا یا ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے گا یا اپنے گھر میں رہے گا یا خانۂ کعبہ میں داخل ہو جائے گا، اس سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ مسلمان حضرت خالد بن ولید کی کمان میں مکہ کے بالائی حصے سے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زیریں حصے سے مکہ میں داخل ہوئے۔[16] قریش کے ایک گروہ نے راہ روکنے کی ناکام کوشش کی۔

فتحِ مکہ کے دن جب اہلِ مکہ ایک شکست خوردہ گروہ کی حیثیت سے آپ کے سامنے آئے تو آپ نے فرمایا، ''بتاؤ آج میں تم سے کیا سلوک کرنے والا ہوں؟'' ''بہتر (خیراً) آپ ایک شریف بھائی ہیں اور ایک شریف بھائی کے بیٹے۔''، قریش نے کہا۔

''آج کے دن (میری جانب سے) تم پر کوئی سرزنش نہیں، (جو ہونا تھا، وہ ہو چکا) جاؤ! تم سب لوگ آزاد ہو۔'' آپ نے جواب میں فرمایا۔ آپ خانۂ کعبہ میں داخل ہوئے اور وہاں تین سو ساٹھ بتوں کو ٹوکے دیتے جاتے اور پڑھتے: ''حق آ گیا اور باطل مٹ گیا۔ باطل مٹنے ہی کی چیز ہے۔'' فتح مکہ میں اپنے سابق دشمنوں کے ساتھ آپ کے حسنِ سلوک پر خود دشمن بھی حیران رہ گئے۔ ابوجہل جیسے سرکش اور منکرِ حق وصداقت کا بیٹا عکرمہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تو آپ نے فرطِ مسرت سے اُٹھ کر اسے خوش آمدید کہا۔ ابن ابی الحدید نے اپنی شرح نہج البلاغہ میں لکھا ہے: ''آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عکرمہ کے علاوہ، خواہ وہ معزز ہو یا غیر معزز، کسی آدمی کو کھڑے ہو کر خوش آمدید نہیں کہا۔ عکرمہ آپ کا سخت مخالف تھا۔ لیکن اسلام لانے کے بعد اسلام کے لیے بڑا کام کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے جہاد کے لیے امداد کی پیشکش کی۔ لیکن عکرمہ نے اسے قبول نہیں کیا اور کہا بہ خدا! میں جہاد کے لیے کوئی معاوضہ یا کوئی امداد نہیں لوں گا۔ اجنادین کے معرکہ میں رسولِ کریمؐ نے ان سے فرمایا: ''آج تم مجھ سے جو مانگو گے، میں دوں گا۔'' عکرمہ نے جواب میں کہا: ''میں آپ سے اپنے لیے مغفرت کی التجا کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں مانگتا۔'' حالانکہ عکرمہ کے علاوہ قریش کے سردار مثلاً سہیل بن عمرو، صفوان بن امیہ اور دوسروں نے رسولِ کریمؐ سے مال و دولت کا سوال کیا۔''[17]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فتح مکہ کے دن آنحضرت ﷺ نے اہلِ مکہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں... ہاں آج تمام مفاخر، خون، تمام خون بہا سب میرے قدموں کے نیچے ہیں... اے قریش! خدا نے جاہلیت کے غرور اور باپ دادا کے نام پر فخر کے (سارے دعوؤں) کو مٹا دیا ہے۔ تمام لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے ہیں۔''

خانۂ کعبہ میں حضرت مریمؑ کی تصویر:

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ آنحضرت ﷺ جب خانۂ کعبہ کے اندر داخل ہوئے اور بتوں کو سرنگوں کیا تو وہاں ایک دیوار پر چند تصویریں تھیں، آپ نے شیبہ سے فرمایا: ''ہر تصویر کو مٹا دو، سوائے ان کے جو میرے ہاتھ کے نیچے ہیں۔'' جب آپ نے ہاتھ اُٹھایا تو وہاں حضرت مسیحؑ اور ان کی والدہ کی تصویریں تھیں۔ ازرقی نے اپنی کتاب 'اخبارِ مکہ' میں اس سلسلہ میں کئی روایتیں نقل کی ہیں۔ ابنِ شہاب کے حوالے سے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''حضرت عیسیٰؑ اور ان کی والدہ کی تصویروں کے سوا تمام تصویروں کو مٹا دو۔''(۱۸)

آپ خانۂ کعبہ کے طرزِ تعمیر سے بھی خوش نہیں تھے۔ آپ اس کی تعمیر نئے سرے سے کرنا چاہتے تھے۔ لیکن آپ نے حضرت عائشہ سے فرمایا: ''اگر تمہاری قوم کا کفر سے تازہ تعلق نہ ہوتا تو میں خانۂ کعبہ کو ڈھا کر (از سرِ نو) حضرت ابراہیمؑ کی بنیادوں پر تعمیر کرتا۔'' لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا کیوں کہ اگر آپ ایسا کرتے تو اس سے نومسلم جو ابھی کفر کی تاریکی سے باہر آئے تھے، فتنہ و ابتلا کا شکار ہو سکتے تھے۔ یہ روایت صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی متفقہ روایت ہے۔(۱۹) کہا جاتا ہے کہ ایک من علم کے لیے دس من عقل چاہیے۔ تاریخ نے ہمیں بار بار بتایا ہے کہ جو لوگ جوش میں ہوش سے کام نہیں لیتے اور حکمت و دانش کی راہ چھوڑ دیتے ہیں، ان کی سرگرمیاں عموماً فتنہ و فساد کا موجب بن جاتی ہیں۔

ہمارا اعتقاد ہے کہ ہمیں ہمیشہ اور خاص طور پر جب ہم ژولیدگیٔ فکر کا شکار ہوں، اپنے مرکز کی طرف رجوع کرنا چاہیے، اسی لیے ہم نے یہاں اپنے اجتماعی مسائل کو سیرتِ طیبہ کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کی ہے۔ ہمیں اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ اگر آج آنحضرت ﷺ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی ذاتِ گرامی ہمارے درمیان موجود ہوتی تو آپؐ ہمارے مسائل کو ان کے صحیح تناظر میں دیکھنے اور نعروں اور پروپیگنڈے کی تاریکیوں میں بھٹکنے والی پاکستانی سوسائٹی کی نجات کے لیے ہمیں کیا کیا ہدایات فرماتے؟

ہم یہاں دو اور باتوں: اخلاقی بحران اور پاکستان میں بڑھتی ہوئی بے ہنگم آبادی پر بھی لکھنا چاہتے تھے [۲۰] جن سے ہماری قومی زندگی، سیاست، معیشت بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ پہلے مسئلے پر (اخلاقی بحران) ہم نے پہلے بھی لکھا تھا کہ آپؐ نے اپنی دعوت کی صداقت پر اپنی اجلی اور بے داغ زندگی کو پیش کیا تھا۔ آپ نے اہلِ مکہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''اس سے پہلے میں تم میں اپنی زندگی کا ایک حصہ بسر کر چکا ہوں۔ تم اس بات پر سوچ بچار کیوں نہیں کرتے؟'' (یونس:۱۶) یعنی میری زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب ہے۔ اگر میں نے کل تک عام زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا تو پھر آج (عہدِ نبوت میں) میں خدا کے بارے میں کیوں کر غلط بات کر سکتا ہوں۔ عجیب بات یہ ہے کہ آپ کی بے داغ سیرت کی شہادت آپ کے ایک بڑے حریف ابوسفیان نے بھی دی، جب اس سے روم کے بادشاہ ہرقل نے پوچھا کہ کیا تم نے کبھی محمد (ﷺ) پر ان کے اعلانِ نبوت سے پہلے جھوٹ بولنے کی تہمت عاید کی؟ نہیں، ابوسفیان نے جواب میں کہا۔ ''جو آدمی (رسول کریمؐ) لوگوں سے جھوٹ نہیں بولتا۔ وہ خدا کے بارے میں کیوں کر جھوٹ بول سکتا ہے''، ہرقل نے کہا۔

یہی اخلاقی بلندی تھی، جسے قرآن نے 'خلقِ عظیم' (القلم:۴) سے تعبیر کیا اور اسی اخلاقی پاکیزگی کی طرف آپ نے اہلِ مکہ کو بلایا۔ چنانچہ قرآن مجید نے آپ کی بنیادی دعوت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ''آپ لوگوں کو حکمت اور کتاب کی تعلیم دیتے ہیں اور ان کا تزکیۂ نفس کرتے ہیں...'' (البقرۃ:۱۲۹) نیز ''لوگوں نے (اپنی پشت پر) جو بوجھ لاد رکھا ہے اور گلے میں طوق اور پاؤں میں جو بیڑیاں پہن رکھی ہیں۔ پیغمبرؐ ان سے نجات دلاتا ہے۔'' یہ 'بوجھ' کیا تھا اور یہ پھندے کون سے تھے، جن سے قرآن نے نجات دلائی؟ قرآن نے دوسرے مقامات پر اسے واضح کر دیا ہے۔ ''مذہبی احکام کی بے جا سختیاں، مذہبی زندگی کی ناقابلِ عمل پابندیاں،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ناقابلِ فہم عقیدوں کا بوجھ، وہم پرستیوں کا انبار، عالموں، فقیہوں کی تقلید کی بیڑیاں، پیشواؤں کے تعبد کی زنجیریں، یہ بوجھل رکاوٹیں تھیں جنھوں نے یہودی اور عیسائیوں کے دل و دماغ مقید کر دیے تھے۔ پیغمبر اسلامؐ کی دعوت نے ان سب سے نجات دلائی۔ اس نے سچائی کی ایسی سہل اور آسان راہ دِکھا دی۔ جس میں عقل کے لیے کوئی بوجھ نہیں، عمل کے لیے کوئی سختی نہیں... افسوس! جن پھندوں سے قرآن نے اہلِ کتاب کو نجات دلائی تھی۔ مسلمانوں نے وہی پھر اپنے گلوں میں ڈال لیے۔"(۲۱) ہماری اجتماعی زندگی کے فساد (Corruption) نے بتا دیا ہے کہ ہم اپنی معنوی زندگی کو سنوارے بغیر اپنے اخلاقی بحران پر قابو نہیں پا سکتے۔ معنوی زندگی کی اصلاح کا نام تزکیۂ نفس اور طہارتِ قلب و نظر ہے۔

غرضیکہ انسان کو صحیح معنی میں انسان بنانا، رسول کریمؐ کی دعوت کا بنیادی مقصد ہے۔

اسلام چوں کہ زندگی کی نفی نہیں، بلکہ اثبات کا قائل ہے۔ اس لیے وہ زندگی کے ہنگاموں، شورشوں اور بدعنوانیوں سے نپٹنے کے لیے ایک اخلاقی ضابطہ رکھتا ہے۔ البتہ آج مسلمان اسے بہ وجوہ عالمی سطح پر منظم نہ کر سکے۔ اقبال کا کہنا ہے کہ "وہ (عرب) شاندار عسکری فتوحات (کے باوجود) کپل (Capil) اور شنکر اچاریہ (Shankar Acharya) جیسی شخصیتیں نہ پیدا کر سکے۔"(۲۲) اقبال کے جانشین فضل الرحمٰن کی بھی یہی رائے ہے کہ ہم قرآن کی اخلاقی بنیادوں پر اپنے قوانین کو ترقی نہ دے سکے۔ عجیب بات یہ ہے کہ البرٹ شویٹزر نے بھی یہی بات کہی ہے کہ "اسلام کو اپنے وسیع پھیلاؤ کے لحاظ سے عالمی مذہب کہا جا سکتا ہے۔ لیکن روحانی طور پر وہ عالمی سطح پر ارتقا نہ کر سکا۔ وہ دنیا اور انسانیت کے لیے کسی ایسی عالمی فکر کی تخلیق نہیں کر سکا۔ (جو زندگی کی) گہرائیوں تک سرایت کر سکے۔ اگر کبھی اس قسم کی فکر نے حرکت کی تو اسے دبا دیا گیا تاکہ قدامت پسندانہ افکار کی بالادستی کو برقرار رکھا جا سکے۔ بہرحال آج کا اسلام اپنی ظاہری سطح کے برعکس جو ایک آدمی کو ایک خاص خیال کی طرف لے جاتی ہے، اپنے اندر تصوف اور اخلاقی گہرائی کے زیادہ جاندار رجحانات رکھتا ہے۔"(۲۳) آج اسلام اور قرآن کے فلسفۂ اخلاق کو کسی سلیقے قرینے سے پیش نہ کرنے کی وجہ سے صرف ہمارا ہی نہیں بلکہ پوری انسانی سوسائٹی کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نقصان ہوا ہے۔

آج ہماری سوسائٹی میں زندگی کے تمام شعبوں میں ایک آدمی کو جن مشکلات اور رسوائیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس سے ہر کوئی نہ صرف واقف ہے بلکہ دکھی اور بیزار بھی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہماری زندگی اسلام یا قرآن کے فلسفۂ اخلاق کا گہرا شعور نہیں رکھتی، سچائی کے اسی شعور کے ساتھ زندہ رہنے کا نام قرآن کی بولی میں تقویٰ ہے، جس کا صحیح ترجمہ خدا سرشاری اور انسان دوستی ہے۔ چنانچہ آج ہمارے بچے صحیح تعلیم وتربیت سے محروم ہیں اور اخلاق اور سول سوسائٹی کے تصور سے ناآشنا۔ اگر ہم ایشیائی ملکوں مثلاً چین یا جاپان ہی کے نظامِ تعلیم و تربیت کا مطالعہ کر لیتے کہ وہاں Room for Moral Education میں بچوں کو ان کے کلاسیکی اخلاقی تصورات کو جدید انداز میں کیسے پڑھایا جاتا ہے اور اس سلسلہ میں کیا کیا تجربات کیے جا رہے ہیں اور بچے کو چوری سے بچنے، سچ بولنے اور ساتھی کی امداد کرنے کے لیے کن کن تجربات سے گزرنا پڑتا ہے، یعنی بچوں کو اخلاقی تصورات کی تعلیم فکری سطح پر نہیں بلکہ عملی سطح پر دی جاتی ہے اور انہیں اخلاقی قدروں کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے تجربات کیے جاتے ہیں۔ یہ وہی بات ہے جسے بڑے بڑے صوفی پیشہ ور مذہبی لوگوں سے کہا کرتے: ''تم نے مردہ علم مردہ لوگوں سے سیکھا ہے۔ہم نے زندہ علم زندہ لوگوں سے حاصل کیا ہے۔''

غرضیکہ اگر ہم ان تجربات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنے اخلاقی تصورات اور فلسفۂ تعلیم وتربیت کو کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت جدید منہج پر پڑھاتے تو آج ہم اپنی سوسائٹی کی اخلاقی قدروں کا ماتم نہ کرتے۔

یہاں ہم نے رسولِ کریمؐ کی سیرتِ طیبہ کے حوالے سے اپنی اجتماعی زندگی کے چند الجھے ہوئے مسائل کا ذکر کیا ہے۔ اگر ہم اخلاص سے معرکہ ہائے حیات میں رسولِ کریم ﷺ کے نقشِ پا کو اپنالیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنی ژولیدگیٔ فکر اور عملی کوتاہیوں پر قابو نہ پاسکیں۔ چنانچہ منزل کا سراغ پانے کے لیے ہمیں ایک بلند نصب العین سے سرشار ہوکر خدائی راہ پر چلنا ہوگا۔ اقبال نے سچ کہا تھا کہ [illegible] کرتی ہے تب کہیں بزمِ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عشق' سے کوئی 'دانائے راز' اُٹھتا ہے، آج پاکستانی کردار اسی ہیرو کی تلاش میں ہے۔

حواشی:

(۱) ابنِ ہشام: السیرۃ النبویۃ، ج ا، (قاہرہ ۱۹۵۵ء)، ص ۲۲۳-۲۲۵ (مصطفیٰ السقا ایڈیشن)

(۲) محمد الخضری: نور الیقین فی سیرۃ سیّد المرسلین، (دمشق ۱۹۸۴ء)، ص ۲۲ (تحقیق شیخ نایف العباس)

(3) A.J. Arberry: The Holy Kuran, An Introduction (London, 1953), P.30

(۴) محمد الخضری: نور الیقین، ص ۴۷۔

(۵) ان دونوں مقامات پر قرآن نے فرمایا کہ جو لوگ صبح شام اللہ کے ذکر سے سرشار ہیں، ان کی صحبت کو چھوڑ کر آپ ان لوگوں سے کوئی تعلق نہ رکھیں، جن کے دل خدا کی یاد سے غافل ہیں اور اپنی خواہشوں کے غلام۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: قرطبی: احکام القرآن، (سورۃ الانعام اور سورۃ الکہف)

(۶) سیرۃ ابنِ ہشام، ج ا، ص ۲۹۶-۲۹۷ (السقا ایڈیشن)

(۷) الخلق عیال اللہ، أحبّهم ابرّهم لعیاله۔ (مشکاۃ المصابیح، کتاب الحبّ فی اللہ)

(۸) اللهم اشهد أن العباد کلهم اخوه

(۹) ترجمان القرآن (ج ا، ص ۱۷۹، ساہتیہ ایڈیشن، دہلی) میں ابوالکلام آزاد نے بڑے مؤثر انداز میں لکھا ہے۔

(۱۰) القرطبی: احکام القرآن، ج ۸، ص ۱۷۴ (تفسیر سورۃ التوبہ: ۶۰)

(۱۱) طہٰ حسین: عثمان، (قاہرہ، ۱۹۵۱ء)، ص ۱۷، لو استقبلتُ ما استدبرت من امری لاخذت فضول اموال الاغنیاء وقسمتها علی الفقراء

(۱۲) حضرت عمرؓ نے فرمایا: اگر میں آئندہ سال زندہ رہا تو دوسری منزل کو جو دوسرے مکانوں سے نمایاں ہے، ڈھا دوں گا۔ تاکہ وحدت کا اظہار ہو۔ A. Banisadr: Islamic Government. (Lexington, U.S.A., 1981), p.82

(۱۳) اس نصف صدی میں ۱۹۵۸ء میں مرحوم محمد ایوب خان اور ۱۹۷۳ء میں بھٹو حکومت نے جاگیرداری کو ختم کرنے کے لیے ابتدائی اصلاحات جاری کیں، لیکن وہ مطلوبہ نتائج حاصل نہ کرسکیں۔ حتیٰ کہ ۱۹۷۷ء کی فوجی حکومت کی قائم کردہ وفاقی شرعی عدالت نے بھی ان 'زرعی اصلاحات' کو غیر اسلامی قرار نہیں دیا۔ اس موضوع پر مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے: 'اسلام کا اقتصادی نظام'؛ سیّد مناظر احسن گیلانی نے: 'اسلام اور جاگیرداری نظام' پر لکھا۔ (اس موضوع پر ۱۹۵۲ء میں گیلانی صاحب نے معارف اعظم گڑھ میں مضمون لکھے تھے)؛ مولانا محمد طاسین کی: 'اسلام اور مروجہ نظام زمینداری'، ان کتابوں میں ملکیتِ زمین کی تحدید اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف اسلام کی صحیح تعبیر و تشریح کی گئی ہے اور خاکسار نے بھی کبھی اس موضوع پر ایک مضمون لکھا تھا۔ ملاحظہ ہو:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

Islam and Current Issues میں ص ۷۶ پر'اسلام اور انسانی حقوق)لاہور، ۱۹۹۸ء۔

(۱۴) محمد الخضری: نور الیقین، ص ۷۵، ابنِ ہشام نے چند جملے اور بھی لکھے ہیں۔ دیکھئے: سیرۃ ابن ہشام، ج ا، ص ۳۲۰

(15) "The self control which Mohammad revealed at Hudaibiyya, his ability to bear occasional humiliation in unimportant issues, in order to achieve an exalted goal, shows that he was a person of unique ability. A man of his mental superiority always keeps the rein in his hands, even when he is forced to yield to the moment and the time soon came, when he was able to reap the fruits of the wisdom which he displayed at Hudaibiyya." [Mohammad, the Man and His Faith (London, 1956), p. 163]

ادہر کئی سال پہلے ۱۹۷۶ء میں مرحوم ڈاکٹر اسماعیل راجی فاروقی نے محمد حسین ہیکل کی عربی کتاب 'حیاتِ محمدؐ' کا انگریزی زبان میں ترجمہ USA سے شائع کیا تھا۔ مذاکرات میں اہلِ مکہ کے جارحانہ اور اشتعال انگیز رویہ کے جواب میں آنحضرتؐ نے جس پیغمبرانہ وقار اور صبر وتحمل کا مظاہرہ فرمایا، اس سے ہمارے دانشور اور سفارت کار روشنی حاصل کر سکتے ہیں۔

(۱۶) احمد تیمور باشا: محمد رسول اللہ ﷺ (قاہرہ، ۱۹۶۶ء)، ص ۷۵

(۱۷) شرح ابن الحدید علی نہج البلاغہ، ج ۴، ص ۲۹۹، بحوالہ محمد رسول اللہؐ از احمد تیمور باشا، ص ۱۴۹

(۱۸) الازرقی: ابو الولید محمد بن عبداللہ: اخبار مکہ المشرقہ، ج ا، (بیروت ۱۹۶۴ء)، ص ۱۱۳۔ (ان النبی صلعم دخل الکعبہ یوم الفتح وفیہا صور الملائکہ وغیرھا... ثم رأی صورۃ مریم فوضع یدہ علیہا وقال امحوا مافیہا من الصور الا صورۃ مریم) نیز دیکھئے ص ۱۱۲ (روایتِ شیبہ)۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مدائن میں ایوانِ کسریٰ میں بھی فنی تصویروں کو باقی رکھا گیا۔ محمد حسین ہیکل 'عمر الفاروق' میں لکھتے ہیں: 'مفتوح ملکوں میں مسلمانوں نے فن (وادب) کے بعض آثار دیکھے، جو ان اصنام سے ملتے جلتے تھے، جو ایامِ جاہلیت میں کعبہ میں تھے، مسلمانوں نے انہیں تلف نہیں کیا۔ بلکہ (حضرت) سعد بن ابی وقاص نے اس بات میں بھی کوئی قباحت محسوس نہیں کہ مدائن میں ایوانِ کسریٰ کو جائے صلاۃ قرار دیا اور ان تصویروں کو بھی باقی رکھا جو قصر کی زینت و رونق کو بڑھانے کے لیے بنائی گئی تھیں۔' (ج ۲، ص ۲۵۸، قاہرہ ۱۹۴۵ء) نیز دیکھئے: سر تھامس آرنلڈ (T.W. Arnold) کی معروف کتاب: 'اسلام میں فنِ تصویر'(Painting in Islam)، New York، 1965

(۱۹) محمد فواد عبدالباقی: اللؤلؤ والمرجان فیما اتفق علیہ الشیخان (قاہرہ ۱۹۷۹ء)، ج ۲، ص ۸۰۔ آپ نے فرمایا: لولا حداثۃ قومک بالکفر لنقضتُ البیت ثم لبنیتہ علی اساس ابراھیم علیہ السلام... (روایت حضرت عائشہؓ)۔ ہماری اخلاص سے یہ رائے ہے کہ موجودہ وقت میں افغانستان کی سابق حکومت نے بدھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تہذیب کے صدیوں پرانے نایاب اور قیمتی آثار کو جس بے رحمی سے تلف کیا ہے، اگر وہ کعبہ میں تصویروں اور اس کی عمارت سے متعلق آنحضرت ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے آگاہ ہوتی، تو وہ بدھ تہذیب کے بارے میں وہ روش اختیار نہ کرتی جس پر دُنیا کے اربابِ نظر نے افسوس کا اظہار کیا تھا۔

(۲۰) اس مسئلے پر تفصیل کے لیے دیکھیے: المعارف، لاہور، (جولائی - دسمبر ۱۹۹۸ء)، ص ۷۷-۱۲۰

(۲۱) ابوالکلام آزاد: ترجمان القرآن، ج ۲، سورۃ الاعراف: ۱۵۷

(۲۲) مظفر حسین برنی: اقبال، چندی گڑھ (بھارت)، ۱۹۸۵ء، ص ۷۱، ۷۲۔ عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ تقریباً یہی بات ابوسلیمان منطقی نے صوان الحکمۃ میں لکھی ہے کہ ان سے ایک رات سیستان کے بادشاہ ابوجعفر نے کہا: 'ہمیں اپنے اہلِ فلسفہ میں سے سقراط، افلاطون اور ارسطو کے پایہ کا کوئی فلسفی نہ ملا۔' اجتمعنا لیلۃ عندالملک ابی جعفر ... فقال الملک: لما وجدنا فیھم ... من یقوم فی انفسنا مقام سقراط او افلاطون او ارسطوطالیس' (طہران ۱۹۷۴ء، ص ۲۹۹، عبدالرحمٰن بدوی ایڈیشن)

(23) Albert Schweitzer: My life and Thought, (London, 1966), P.151.

© rasailojaraid.com